بہار آخر شد

ڈاکٹر اسلم انصاری

بعض اوقات قرطاس وقلم کا لاؤلشکر — کتنا بے سروساماں نظر آنے لگتا ہے، اس کا اندازہ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ کے عرصے میں مجھے کئی بار ہوا۔ میں نے رثائیہ نظم اس لیے لکھی تھی کہ شدتِ احساس نے اظہار کے لیے خود ہی فوری طور پر ایک پیرایۂ بیان اختیار کرلیا تھا۔ میں نے ان کی ذات کے بارے میں جب بھی لکھنے کے لیے سوچنا شروع کیا، سلسلۂ خیال ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ باوجود یکہ ایک عرصے سے صورتِ حال یہ تھی کہ ملنا ملانا، سالوں اور مہینوں میں ہوتا تھا، پھر بھی ایک طویل مدت تک ایسا تھا کہ ملاقاتیں کم سے کم وقفوں سے ہوتی تھیں او رممکنہ حد تک طویل ہوجاتی تھیں، ادب، شاعری، علوم وفنون، تاریخ و تہذیب، شخصیات، واقعات، لطائف ومطائبات، غرض بیان اور تبصرے کے قابل کوئی موضوع کم ہی بچتا تھا۔ ہم عصر صورتِ حال او رہمہ گیر انحطاطِ اقدار بہت حد تک عمومی موضوع ہوتا تھا، انھیں میری ذات اور میری ناچیز کاوشوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ میرے ماضی میں جھانکنا اُنھیں بہت مرغوب تھا۔ میرے اندازِ بیان کے آئینے میں گزشتہ نصف صدی کی علمی اور ادبی تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف پہلوؤں کو دیکھنا انھیں بہت پسند تھا۔ اس لیے اُن کے پاس ہر وقت ایسے سوال خاصی تعداد میں موجود رہتے تھے جن کے ذریعے وہ میرے جذبۂ اظہار کو مسلسل مہمیز کرتے تھے، اُن کی موجودگی میں بعض اوقات مہمیز کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر، اور میں انھیں دیکھ کر اکثر باتیں خود ہی سمجھ جاتے تھے اور شروع سے شروع کرنے کی بجائے کہیں بیچ سے بات شروع ہوجاتی تھی، ادیان ومسالک کے نازک ترین معاملات ومسائل پر بعض اوقات استفہام کے نتیجے میں، اور بعض اوقات استفہام کے بغیر مکالمہ جاری رہتا تھا۔ بعض بنیادی معاملات طے شدہ تھے۔ اس لیے ان میں کسی قسم کے اختلاف کا امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو احترام اور محبت سے سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا۔ بعض مہماتِ مسائل میں اُن کے سوالات اور نقطہ ہائے اعتراض کے جواب میں میری گفتگو تقریر کا رنگ اختیار کرجاتی تھی۔ اور میں دیکھتا تھا کہ وہ خفیف اور دل پزیر مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے جاتے تھے۔

ابتدائی ملاقاتوں میں جن کا آغاز اب سے اور کچھ نہیں تو بیس برس پہلے ہوا تھا۔ وہ اور عزیزِ مکرّم وحید الرحمٰن خان ساتھ ہی کرم فرماتے تھے۔ دراصل ان دونوں میں دوستی اور محبت کا رشتہ اتنا گہرا اور پائیدار تھا کہ بعض اوقات وہ مجھے ایک ہی شخص معلوم ہوتے تھے۔ اب وحید الرحمٰن خان کہتے ہیں کہ گفتگو تو زیادہ تر وہی کرتے تھے۔ میں تو صرف سنتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ گفتگو کس رُخ پر جارہی ہے۔ اور اب اُس نے اچانک کیا رخ اختیار کرلیا۔

اصل قصہ یہ تھا کہ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان میں کامل ہم آہنگی تھی۔ اور میں ان دونوں باصلاحیت

نوجوانوں کے ساتھ آج کی زبان میں INTER-ACT کرکے بے حد راحت محسوس کرتا تھا۔ یہاں مجھے ایک بات یاد آتی ہے۔ اٹلی کے شہرۂ آفاق شاعر اور ڈوائن کامیڈی کے خالق ڈانٹے کو اس کے مخالفین نے اُس کے وطن فلارنس سے جلاوطن کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بقیۃ العمر شہر بہ شہر، مارا مارا پھرا۔ کبھی کسی نواب کے ہاں پناہ لی، کبھی کسی ڈیوک کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ ایک بار کسی نواب کے دربار میں ایک درباری مسخرا کچھ ایسی مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا کہ نواب اور درباری ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ لیکن ڈانٹے کے چہرے پر وہی فکر انگیز سنجیدگی تھی جو اس کی اکثر تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ہنسنا تو دور کی بات ہے، درباری مسخرے کی حرکات پر اُس کے ماتھے کی گرہ تک نہ کھلی۔ اس کے اس حال کو دیکھ کر نواب نے پوچھا: کیوں صاحب آپ محظوظ نہیں ہوئے! ڈانٹے نے جو جواب دیا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس نے کہا ____ "Like to Like"۔ یعنی کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ناظر و منظور ایک دوسرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ سامع اور متکلم کا بھی یہی حال ہے۔ بعض لوگوں کی موجودگی ایسی خیالات کش ہوتی ہے کہ کوشش کے باوجود انسان کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر پاتا۔ جب کہ بعض لوگوں کو دیکھتے ہی، یا ملتے ہی خیالات کا دھارا پھوٹ نکلتا ہے۔ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان کے ساتھ میرا یہی معاملہ تھا۔ سید ذوالکفل شروع سے ہی وسیع المطالعہ تھے اور حسنِ گفتار تو اُن کی خاندانی وراثت تھی۔ وہ جستہ جستہ اُن تمام موضوعات کا ادراک رکھتے تھے، جن سے راقم کو ایک عرصے سے دلچسپی رہی ہے۔ ان اشتراکات میں استثناء کے کئی پہلو بھی تھے۔ بعض موضوعات اُن کے ممنوعات میں سے تھے، بعض سے مجھے اجتناب تھا۔ اس کے باوجود دائرۂ گفتگو بہت وسیع رہتا تھا۔

اُن کی ذاتی خوبیوں میں، شرافتِ نفس اور سلامتیٔ طبع کو اوّلیت حاصل تھی۔ سلامت روی اُن کا شیوہ تھا، لیکن اپنی رائے کے اظہار میں بھی انھیں کوئی باک نہیں تھا اور تبلیغ کا حق ادا کرنے سے بھی اُنھیں کوئی روک نہیں سکتا تھا، لیکن وہ افہام و تفہیم کے قائل تھے اور درست استدلال کو قبول کرنے میں انھیں ذرا بھی تأمل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن خیال رہے کہ ہماری گفتگو بحث و مناظرہ ہرگز نہیں ہوتی تھی۔ میرا Privilege یہ تھا کہ میں بعض فلسفیانہ امور میں، نیز بعض تمدنی مسائل کے حوالے سے کچھ نکات کی تصریح کرتا تھا۔ جو میں دیکھتا تھا کہ اُن کے لیے طمانیت کا باعث ہوتی تھی۔ اشعار اور الفاظ کی تشریح و تعبیر کے حوالے سے بھی اکثر یہی صورتِ حال ہوتی تھی، ____ لیکن ان تمام حوالوں سے وہ اپنی سوچی سمجھی رائے میں تفصیل سے بیان کرتے تھے۔

میر تقی میرؔ کا ایک شعر ہے:

بہار اک طرف، اک طرف ابر ہے
گلستاں کے ہیں دونوں پلّے بھرے

شرافت اور نجابت اگر ترازو کے دو پلّے ہیں تو قدرت نے اُن کے یہ دونوں پلّے پوری طرح بھر دیئے تھے۔ نجابت اُن کی تاریخی اعتبار سے معروف و مسلّم تھی۔ وہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے تھے۔ اُن کے والد پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب ایک نیک نام استاد اور منتظم ہیں۔ اُن کے ماموؤں میں سید ابوذر بخاریؒ اور سید عطاء المحسن بخاریؒ کے نام ہائے نامی سرفہرست ہیں۔ اُن کے برادرِ اکبر سید محمد کفیل بخاری دینی صحافت و خطابت کے اعتبار سے گزشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصے میں بہت خوب نام کما چکے ہیں اور اب وہ خود بھی شہرت کے بامِ عروج کی طرف تیزی سے رواں دواں تھے۔ یہ نسبتوں کا عالم

تھا۔ ذاتی شرافت کے حوالے سے اُن کے اقران ومعاصرین شاہدِ عدل ہیں۔غرض اس گلستاں کے دونوں پلّے پورم پُور بھرے ہوئے تھے۔ ذہن بنیادی طور پر تخلیقی تھا۔اسی لیے آخر آخر میں شعر گوئی کی طرف توجہ کی اور بعض خوبصورت اور قابل ذکر نظمیں وجود میں آئیں۔''شام جھانکتی ہوئی'' کے عنوان سے ایک پورا سلسلۂ نظم وجود میں آ گیا۔آخری بار جب ملتان کو مراجعت کی تو عندالملاقات میں نے کہا کہ اس طرح کی دس بیس نظمیں اور لکھ دیجیے تو شاعری کی ایک مختصر مگر خوبصورت کتاب بن سکتی ہے۔ میری اُس بات سے انھوں نے اتفاق کیا۔اب معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ماضی قریب میں کچھ ایسی نظمیں بھی لکھ ڈالی تھیں جن میں ہئیت اور موضوع ہر دو اعتبار سے کچھ نئے تجربے کیے گئے تھے۔ایک نظم کے بارے میں میرا خیال ہے کہ بھوپالی اردو میں لکھی گئی ہے لیکن ساتھ ہی مجھے خیال آیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ حیدرآبادی اردو میں لکھی گئی ہو۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اُن کی آخری نظموں کے رشتے بے حد تجریدی موضوعات سے ملتے جارہے تھے۔ان نظموں کی فضا سے لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر کسی اور سمت اور کسی اور سطح پر سفر کررہے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے،۱۹۹۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے کہ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان نے کچھ ہم خیال دوستوں اور بزرگوں ، بالخصوص پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی سرپرستی اور نگرانی میں فاران اکادمی کے نام سے ایک ادبی انجمن کی تشکیل کی۔جن سینئرز نے معمولاً اس کے اجلاسوں میں شرکت شروع کی اُن میں عبدالمجید خان ساجد اور پروفیسر مختار ظفر بھی شامل تھے۔خاکسار بھی ان عزیزوں کی پاسِ خاطر سے فاران اکادمی کے اکثر اجلاسوں میں شریک ہوتا رہا۔ یہ اجلاس سنٹرل کالج میں منعقد ہوتے تھے۔اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ سید ذوالکفل اُن ایام میں اسی کالج میں ایم اے انگلش کی کلاس کے طالب علم تھے اور یہاں کے ماحول میں باوجود نوعمری کے اعتبار واثر پیدا کرچکے تھے۔علاوہ ازیں مرزا عبدالغنی اس ادارے کی انتظامیہ میں شریک تھے اور مرزا صاحب اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان میں پرانا اخلاص تھا۔چنانچہ اس اکادمی کو اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ایک حد تک خوشگوار اور سازگار ماحول حاصل تھا۔اس کے نوجوان اراکین میں شعیب ودود، مستحسن خیال اور مختار پارس جیسے باصلاحیت لوگ شامل تھے۔گورنمنٹ کالج سے میرے شعبۂ اردو کے رفیقِ کار منیر احمد شامی بھی اسی قافلے میں شامل تھے۔اجلاسوں سے پہلے اور بعد کی غیر رسمی صحبتیں اصل اجلاسوں سے بھی زیادہ اہم تھیں۔سید ذوالکفل اور وحید الرحمٰن خان اپنی ذہانت اور متانت کے اعتبار سے سب میں نمایاں تھے۔اور اپنی صفاتِ جمیلہ سے روز بروز ''عزیز دلہا'' ہوتے چلے گئے۔ان دونوں نوجوانوں کی ایک بڑی صفت دوستوں اور بزرگوں کے بعض مہماتِ امور میں دلچسپی لینا اور مسائل کے حل میں عملی معاونت کرنا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس وصفِ خاص میں یہ دونوں عزیز ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ یہ عزیز جب یہ دیکھتے تھے کہ میرا بہت سا کلام ابھی یکجا نہیں ہوسکا، یا میری بہت سی نثری تحریریں طبع نہیں ہوسکیں تو ہر نوع کی کوشش اور تدبیر اس کام میں صرف کرتے تھے کہ مطلوبہ مقاصد بہ طریقِ احسن اور بہ شرطِ حفظِ مراتب حاصل ہوجائیں۔ دستِ قدرت نے اُن کے اخلاص میں بہت برکت دی،اس لیے نتائج حسبِ دل خواہ رہے۔

سید ذوالکفل بخاری کو قدرت نے دل ودماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔وہ اپنے خاندانی پس منظر کے اعتبار سے تعلق داری اور معرفتِ قدیمہ کے اکرام کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔اسی لیے باہمی دوریوں کو قربتوں میں تبدیل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔انھوں نے نثر میں جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر کتابوں پر تبصروں، کالموں اور ادبی اور نیم سیاسی مضامین کی

صورت میں ہے۔ اُن کی روشنی میں دیکھیں تو اعتدال اور انصاف پسندی نیز حسنِ ادراک ان کی اوّلین خصوصیات قرار پاتی ہیں، جو لوگ اُن کو قریب سے جانتے تھے اور اُن کی صلاحیتوں کا ادراک رکھتے تھے وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اُن کا تحریری سرمایہ اُن کی حقیقی صلاحیتوں کا صرف ایک پرتَو ہے۔ لیکن جو کچھ ہے، اس کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی جودتِ طبع سے اپنے ماحول کو خوب روشن کیا، یہ جوت جہاں جہاں پہنچی، ذہن وفکر کے اُجالے اُس کے ساتھ رہے۔ اُن کی وفات کے چند دن بعد ہی اتفاقاً دوستِ گرامی ڈاکٹر خورشید رضوی سے فون پر میری گفتگو رہی۔ میں نے غیر اختیاری طور پر اُن سے اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر کیا، وہ بھی اس خبر سے ملول تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ اُن کی صرف چند ہی ملاقاتیں سعودی عرب میں اُن سے رہیں لیکن وہ اُن کی طبعی خوبیوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا:

> ''سید ذوالکفل میرے ذرا سے کہنے پر کسی عربی رسالے میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی فوٹو کاپی دینے کے لیے بہت دور سے اور ٹریفک کی دشواریوں کو عبور کر کے تشریف لاتے تھے۔ اور لگتا تھا کہ وہ کوشش کر کے وقت نکال کر صرف اس کام کے لیے آئے ہیں۔''

میں نے عرض کیا کہ وہ اس نیاز مند کے توسط سے ایک عرصے سے آپ کے ساتھ اخلاص اور محبت کا رشتہ استوار رکھتے تھے۔ البتہ اُن کے اس عمل کو اُن کے حسنِ کردار کی ایک ہلکی سی جھلک سمجھنا چاہیے۔ ابھی حال ہی میں جنابِ مستحسن خیال نے بتایا کہ اب کی بار پاکستان آئے تو اُن کو مجموعۂ شاعری مرتب کرنے کا مشورہ دیا اور ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان سے مشورہ اور اس نیاز مند سے (بقول اُن کے) رہنمائی حاصل کرنے کی بار بار تاکید کی۔ اپنے شاگرد اور رفیقِ عزیز الیاس میراں پوری کو بھی اُن کی تاکید رہی کہ راقم کے بعض طباعتی امور میں معاون رہیں۔ (اُن کے انتقال کی غم انگیز خبر بھی الیاس میراں پوری ہی نے فون پر دی تھی)۔

میرے بچوں کے لیے اُن کی محبت اور خیر طلبی مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ بعض اوقات انھیں کوئی مسئلہ بتا دینا کافی ہوتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پتا چلتا تھا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال چکے ہیں۔ ایسے اخلاص، ایسی خیر طلبی اور انسان دوستی کا عام طور پر پرچار تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے عملی نمونے خال خال ہی ملتے ہیں۔ سید ذوالکفل بخاری ان خوبیوں کا ایک خوبصورت مرقع تھے اور اپنے اقران ومعاصرین کے لیے ہی نہیں، سب کے لیے ایک دلآویز نمونۂ عمل تھے۔ بلاشبہ اگر اُن کے برادرِ اکبر سید محمد کفیل بخاری صاحب نے سیاست، صحافت اور خطابت میں خاندان کا نام روشن کیا ہے، تو سید ذوالکفل بخاری علم وادب اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے فخرِ خاندان تھے۔ گو اُن کی آواز، اُن کا لہجہ ابھی تک کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہے ہیں لیکن اُن کی بازیافت افسوس کہ اب ممکن نہیں۔ برسوں کے تعلق کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ ''روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد'' لیکن وہ ہماری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ع　　رفتید، ولے نہ از دلِ ما